سرائیکی تحریک۔ ایک جائزہ

محمد منیر خاور

ریسرچ فیلو، قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت، اسلام آباد

تحریک پاکستان کے دوران ہندوستان کے مسلمانوں نے قائداعظم کی قیادت میں متحد ہو کر حصہ لیا اور انگریز و ہندو دو مخالف قوتیں یہ سوچنے پر مجبور ہو گئیں کہ مسلمان ایک الگ اور منفرد قوم ہیں لہٰذا ان کو آزادی دئے بغیر ہندوستان کے مسئلے کا اور کوئی متبادل حل نہیں ہو سکتا۔ لیکن قیام پاکستان کے فورا بعد بدقسمتی سے قائداعظم ہم سے جدا ہو گئے اس طرح ان کا تصور و نظریہ ملک و قوم کو مطلوبہ نتائج سے ہم کنار نہ کر سکا اور ان کے بعد آنے والے قائدین نے کبھی جانبداری اور کبھی نا اہلی سے ایسے اقدامات اٹھائے جس سے صوبوں میں نفرتوں اور کدورتوں نے جنم لیا اور اس طرح ملک دو حصوں میں بٹ گیا۔ یہ مقالہ " سرائیکی قومی موومنٹ " کا ایک جائزہ ہے جو پنجاب کے جنوبی علاقوں میں قومیتی حقوق کے حصول کے لئے علاقائی و لسانی بنیادوں پر متحرک ہے۔ اس میں تحقیق طلب گوشوں کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ تحریک کن بنیادوں پر سیاست کر رہی ہے

سرائیکی تحریک کا بنیادی فلسفہ

قدیم وادی سندھ میں آریاؤں کے دور اقتدار میں ایک غیر آریائی نوجوان گناڈھیا (GUNADHAYA) نے ٹیکسلا یونیورسٹی میں سنسکرت کی تعلیم حاصل کی اور پھر اس وقت کے حاکم مہاراجہ شالواہن (SALVAHAN) کے دربار میں وزیر مقرر ہوا۔ دربار کی زبان سنسکرت تھی۔ دربار میں سنسکرت بولنے والوں نے مقامی پشاچی زبان بولنے والوں کے خلاف محاذ قائم کر لیا جس کے نتیجے میں گناڈھیا نے جس کی مادری زبان پشاچی تھی، قسم کھائی کہ وہ آئندہ سرکاری زبان سنسکرت استعمال نہیں کرے گا لہٰذا وہ دربار چھوڑ کر مقامی لوگوں میں جا کر رہنے لگا اور اپنی زبان اور ثقافت سے مکمل آگاہی حاصل کی۔ گناڈھیا نے ایک پشاچی استاد سے " برہت کتھا " سنی جو سلسلہ در سلسلہ کہانیوں پر مشتمل تھی۔ یہ کہانیاں سننے کے بعد وہ بیرونی زبان اور ثقافت کے سحر سے آزاد ہو گیا۔ گناڈھیا نے اپنے تشخص کا ادراک حاصل کرنے کے بعد " برہت کتھا " کی کہانیوں کو منظوم شکل دی اور پھر اپنی تخلیق کو مہاراجہ شالواھن کے دربار میں لے گیا لیکن سنسکرت زبان و ثقافت کے زیر اثر مہاراجہ نے علم و ادب کے اس خزینے کو مقامی زبان میں ہونے کے سبب ٹھکرا دیا۔ گناڈھیا حکمران کے متعصبانہ رویے سے مایوس ہو کر اپنی اس تخلیق سمیت جنگل میں چلا گیا اور جنگلی جانوروں کو اپنے اشعار سنانے لگا۔ جنگلی جانور اس کے ارد گرد بیٹھ جاتے اور درد بھری کہانیاں سن کر آنسو بہاتے۔ گناڈھیا ہر صفحہ پڑھنے کے بعد اسے پھاڑ کر آگ میں ڈال دیتا۔ جب مہاراجہ کو اس بات کی خبر ملی کہ جنگلی جانور گناڈھیا کے اشعار سن کر رو دیتے ہیں تو وہ گناڈھیا کے پاس گیا اور اسے کہا کہ " برہت کتھا " اسے دے دی جائے لیکن اس وقت تک سات میں سے چھ جلدیں شعلوں کی نذر ہو چکی تھیں (۱)۔

سرائیکی تحریک کے حامی اس داستان کی بنیاد پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ قدیم وادی سندھ میں زبانوں اور ثقافتوں کے تضادات کی روایات تقریباً دو ہزار سال پرانی ہیں۔ ان کے خیال میں یہ کہانی قدیم وادی سندھ میں قوم پرستی اور بیرونی تسلط سے نجات کی علامت ہے۔ علاوہ ازیں ان کا دعویٰ ہے کہ سنسکرت اور پشاچی زبانوں کا تضاد پنجابی اور سرائیکی زبانوں کے اختلاف کی صورت میں آج بھی موجود ہے لہٰذا سرائیکی عوام کی جانب سے اپنی تاریخ اور ثقافتی ورثے کی تلاش و شناخت کا مسئلہ صدیوں کے تسلسل کی ایک کڑی ہے جس کا بانی گناڈھیا ہے۔ ہم مذکورہ بالا نکات کا تنقیدی جائزہ تو بعد

میں پیش کریں گے لیکن یہاں ان تمام آراء کو صفحہ قرطاس پر لانا مقصود ہے جن کی بنیاد سرائیکی صوبہ کا محور خیال کی جاتی ہے سرائیکی تحریک کے حامیوں کا موقف یہ ہے کہ ہماری زبان اور ثقافت ' پاکستان کی دیگر زبانوں اور ثقافتوں سے الگ اور قدیم ہے۔

تنقیدی جائزہ

تحریک پاکستان کا مطالعہ یہ ثبوت فراہم کرتا ہے کہ اس تحریک کے خدوخال خالصتاً جمہوری روایات کے امین تھے اور اس تحریک کی کامیابی کے لئے مسلمان قوم کے تمام منتشر عناصر نے اس قدر متحد ہو کر حصہ لیا کہ دونوں مخالف قوتیں یعنی ہندو اور انگریز ' مسلمان قوم کے اتحاد و اتفاق کے سامنے بے بس ہو کر یہ سوچنے پر مجبور ہو گئیں کہ اس قوم کو آزادی دینا ہی قرین مصلحت ہے۔ در حقیقت یہ اس لئے ممکن ہوا کہ جب قائداعظم ۱۹۳۴ء میں ہندوستان تشریف لائے تو انہوں نے مسلمانوں کے حقوق و مطالبات کی بنیاد پر نہ صرف ایک واضح منزل متعین کی بلکہ اس کے حصول کے لئے مسلم قوم کو متحد کر کے جمہوری روایات کے مطابق انگریزوں اور ہندوؤں سے گفت و شنید کی جسے موثر اور باوزن سمجھا گیا۔ ۱۹۴۰ء میں منظور کردہ قرارداد پاکستان کو عملی جامہ پہنانے کے لئے مسلم لیگ کے جھنڈے تلے قائد اعظم کی مدبرانہ قیادت میں آئینی تحریک چلا کر مسلمانوں میں بیداری و آزادی کی ایسی روح پھونکی کہ ۱۹۴۶ء کے انتخابات کے فیصلہ کن نتائج کے بعد انگریز کو مطالبہ پاکستان پر سنجیدگی سے سوچنا پڑا۔

لیکن یہ امر نہایت قابل افسوس ہے کہ وہ پاکستانی مسلمان جو اپنی ابدی تعلیم اور اپنے دینی اصول و ضوابط کے باعث زیادہ جمہوریت نواز تھے تخلیق پاکستان کے کچھ عرصہ بعد ایسے حالات و واقعات سے دو چار ہوئے جو انہیں اپنے طے شدہ جمہوری راستے اور روایات سے بہت دور لے گئے۔ قائد اعظم کی شخصیت ' ان کی سیاسی زندگی کے اتار چڑھاؤ ' پاکستان کے لئے جدوجہد اور پھر تخلیق پاکستان کے بعد قائم ہونے والے اقتصادی ' معاشرتی اور سیاسی زندگی کے بارے میں فرمودات اس قدر مستند و معتبر ہیں کہ اگر اس کو مشعل راہ بنا کر عمل کیا جاتا تو یقیناً ہم بہت سے ایسے مسائل سے دو چار نہ ہوتے جو آج ہمیں در پیش ہیں۔ قائد اعظم کی جمہوریت پسندی اور جمہوری طریقوں سے پاکستان کی تخلیق اور پھر یہ پختہ یقین کہ پاکستان کی بقاء ' ترقی اور استحکام کا انحصار بھی جمہوریت کے راستے پر گامزن رہنے میں ہے ' ایسی وجوہات تھیں جن کے سبب قائد اعظم نے قوم کو جمہوریت کا نظام اپنائے رکھنے کی بار بار تلقین کی۔ پاکستانی قوم کی تشکیل کے بعد انہوں نے قومی سطح سے نیچے ہر قسم کی عصبیتوں اور گروہ بندیوں کو بالائے طاق رکھنے اور ان سے بالاتر ہو کر صرف اور صرف پاکستانی بننے کی نصیحت فرمائی اور اسی کو پاکستان کی ترقی کے لئے نصب العین قرار دیا۔ قائداعظم نے ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ۔

" اگر ہم اس عظیم مملکت پاکستان کو خوش اور خوشحال دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی تمام تر توجہ اس ملک کے عوام اور بالخصوص غریبوں کی فلاح و بہبود کے لئے صرف کرنا ہو گی۔ اگر آپ اپنے ماضی کے تمام جھگڑے ختم کر کے اور باہم تعاون کر کے کام کریں گے تو کامیابی آپ کی ہو گی۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر آپ نے اپنے ماضی کو بھلا دیا اور مل جل کر کام کیا اور یہ نہ دیکھا کہ وہ کس طبقے سے تعلق رکھتا ہے یا یہ کہ اس سے آپ کے ماضی میں کیسے ہی تعلقات کیوں نہ رہے ہوں یا یہ نہ دیکھا کہ اس سے قبل وہ کس رنگ ' نسل ' قوم یا عقیدے سے تعلق رکھتا تھا ' دوسری اور آخری بات میں یہ کہتا ہوں کہ سب اس مملکت کے شہری ہیں جنہیں برابر کے حقوق و مراعات حاصل ہیں اور برابر کی ذمہ داری ہے۔ اگر آپ میں یہ تمام چیزیں ہیں تو آپ کی ترقی اختتام پذیر نہیں ہو گی " (۲)۔

پھر فرقہ وارانہ اختلافات کے متعلق فرمایا کہ

" اکثریت کی اقلیت کے ساتھ جو تلخی ہے وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دور ہو جائے گی۔ چاہے وہ ہندو طبقے میں ہو یا مسلمان طبقے میں۔ مسلمانوں میں پٹھان ' پنجابی ' شیعہ ' سنی ہیں جبکہ ہندوؤں میں برہمن ' ویش ' کشتری ' بنگالی اور مدراسی بھی ہیں ' یہ تفریق ختم ہو جائے گی۔ اگر واقعی آپ مجھ سے پوچھیں تو یہ چیز ہندوستان کی آزادی کی راہ میں بڑی رکاوٹ تھی اس کو ختم کرنے کے لئے ہمیں بہت پہلے کام کرنا چاہئے تھا" (۳)۔

در حقیقت قائد اعظم جانتے تھے کہ دشمنوں کے منظر سے ہٹ جانے کے بعد قوم کے افراد کے درمیان مختلف قسم کے گروہی و فروعی اختلافات کے پیدا ہونے کے امکانات بڑھ جائیں گے۔ اسی بنا پر انہوں نے اپنے صدارتی خطاب میں قوم سے اپیل کی کہ وہ اپنے علاقائی ' لسانی اور فرقہ وارانہ اختلافات کو بھلا کر صرف اور صرف

پاکستانی بن جائیں ۔ اس ضمن میں انہوں نے واضح طور پر اس بات کو نصب العین قرار دیتے ہوئے اس امید کا اظہار کیا۔

" آپ دیکھیں گے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نہ یہاں کوئی ہندو ہندو رہے گا نہ مسلمان مسلمان ۔ مذہبی معنوں میں نہیں کہ یہ ان کا ذاتی عقیدہ ہے بلکہ سیاسی معنوں میں ریاست کے شہری کی حیثیت سے " (۴)۔

قائد اعظم کی طرف سے متعین کیا جانے والا یہی نصب العین در اصل نظریہ پاکستان ہے جو اس قوم کو مضبوط و مستحکم اور ترقی یافتہ بنانے کا ذریعہ ہے۔

اگر قائد اعظم کی ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر کو حرز جاں بنا کر اصحاب اقتدار نے آئین و قانون مرتب کرنے کی طرف توجہ دی ہوتی تو یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ پاکستان غیر جمہوری حکومتوں کے باعث سیاسی بحرانوں سے دو چار نہ ہوتا اور جس طرح آج کل گروہی ' نسلی اور صوبائی تعصبات جنم لے رہے ہیں یہ کبھی سر نہ اٹھا سکتے ۔ مگر افسوس کہ جمہوری نظام کے لئے مزاج میں جس پختگی اور دور اندیشی کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہم میں من حیث القوم ابھی تک پیدا نہ ہو سکی ۔ نتیجتاً اس وقت ملک میں پاکستانی قومیت کے تصور یک جہتی کو دھندلانے کی دانستہ اور نادانستہ کوششیں کی جا رہی ہیں اور متعدد لسانی اور قومیتی بنیادوں پر ایسی تنظیمیں قائم ہو چکی ہیں جو اپنے مخصوص مفادات کی تکمیل کی خاطر دن رات سرگرم عمل ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد پاکستانی قومیت کا جو واضح تصور ابھر کر سامنے آیا تھا وہ اب دھندلا ہوتا جا رہا ہے ۔ پاکستانی ہونا اتنا اہم نہیں رہا جتنا کہ کسی مخصوص گروہ سے تعلق خاطر رکھنا ۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد اس قدر دور رس اقدامات نہ اٹھائے گئے کہ پاکستانی قومیت کے تصور یک جہتی کو دوام نصیب ہوتا ۔ اگر ایسا ہوتا تو آج ہم ایک مستحکم اور ترقی یافتہ قوم ہونے پر فخر کر سکتے ۔ لیکن بد قسمتی سے ملک میں ارادی اور غیر ارادی طور پر کئے گئے اقدامات اور رویوں نے اس نوع کی سیاسی ' دینی ' معاشرتی اور معاشی فضا پیدا کر دی کہ بیشتر توجہ قومی مفادات کی بجائے ذاتی مفادات پر مرتکز ہو کر رہ گئی اور اس طرح ملک کا ایک بڑا حصہ پاکستان سے الگ ہو گیا۔

تاریخ قوموں کی زندگی میں ایک نہایت اہم ریکارڈ کی حیثیت رکھتی ہے ۔ اگر قومیں اپنی تاریخ سے سبق حاصل نہیں کرتیں تو تاریخ لازماً انہیں سبق سکھا کر رہتی ہے۔

بقول شاعر۔

جو قوم مٹا دیتی ہے تاریخ کو اپنی
اس قوم کا جغرافیہ باقی نہیں رہتا

لہٰذا ہمیں اسی بات کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ ۱۹۷۱ء میں پاکستان کے ایک بڑے صوبے مشرقی پاکستان نے علیحدگی اختیار کر لی ۔ پاکستان جو آبادی کے لحاظ سے دنیا کا پانچواں بڑا ملک تھا اب چھوٹے ملک میں تبدیل ہو گیا ۔ سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ آخر ایسا کیوں ہوا کہ ایک ساتھ آزادی کی جدوجہد کرنے والے بھائیوں نے ہم سے ناراض ہو کر علیحدگی کا فیصلہ کر لیا ؟ یہ سب کچھ جاننے کے لئے ہمیں ان تلخ حقائق کو تسلیم کرنا ہو گا جو علیحدگی کا محرک بنے اور اس کے ساتھ ساتھ موجودہ پاکستان کی سلامتی کے لئے ان حقائق کی بنیاد پر ایسے اقدامات اٹھانے چاہئیں کہ ملک کو آئندہ ایسے سنگین نتائج سے دو چار نہ ہونا پڑے۔

یہ حقیقت تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے کہ بنگالی مسلمان تخلیق پاکستان کی جدوجہد میں پیش پیش تھے ۔ پاکستان کی خالق جماعت مسلم لیگ کا قیام ۱۹۰۶ء میں نواب سلیم اللہ کی بھر پور کوششوں سے بنگال میں عمل پذیر ہوا تھا ۔ ۱۹۴۰ء میں قرار داد پاکستان مشہور بنگالی مسلم راہنما اے کے فضل الحق نے پیش کی تھی ۔ ۱۹۴۵ء کے صوبائی انتخابات میں بنگال ہی میں مسلم لیگ نے مسلم سیٹیں حاصل کرنے کا ریکارڈ قائم کیا تھا جہاں انہوں نے ۱۱۹ مسلم سیٹوں میں سے ۱۱۶ سیٹیں حاصل کی تھیں ۔ آسام کو پاکستان کا حصہ بنانے کے لئے مولانا بھاشانی نے موثر کردار ادا کیا اور ان کی کوششوں سے سلہٹ پاکستان میں شامل ہوا ۔ مولانا بھاشانی ۱۹۴۶ء میں آسام کی صوبائی مسلم لیگ کے صدر تھے ۔ ان تمام حقائق کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ بنگالی مسلمان جنہوں نے قیام پاکستان کے لئے بیش بہا قربانیاں دیں آخر انہوں نے پاکستان سے علیحدہ ہونے اور ایک نیا ملک بنگلہ دیش بنانے کا فیصلہ کیوں کیا ؟ اس سانحہ کے بعد ہمارے ہاں مخصوص سوچ کے حامل اخبارات اور دانشوروں نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ یہ سب کچھ بنگالی ہندوؤں اور غیر ملکی مداخلت کی وجہ سے ہوا ۔ حالانکہ حقائق اس کے بالکل بر عکس ہیں ۔ ایک بھائی دوسرے بھائی سے الگ ہونے کا فیصلہ اسی وقت کرتا ہے جب اسے اپنے سماجی و معاشی مفادات پر یقینی زد پڑتی ہوئی دکھائی دے لہٰذا ایسی غیر یقینی صورتحال میں مذہب بھی انہیں متحد و متفق رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

اس بات میں کوئی وزن نہیں کہ مشرقی پاکستان کے لوگ اسلام سے محبت اور دیگر مذہبی شعائر کی ادائیگی میں مغربی پاکستان کے لوگوں سے کسی طرح کم تھے ۔ جہاں تک مشرقی پاکستان کی علیحدگی میں بیرونی طاقتوں کی مداخلت کا تعلق ہے تو حقیقت یہ ہے کہ بیرونی طاقتوں کا تعلق محض ضمنی اور ثانوی نوعیت کا تھا ۔ اس بات کے حق میں یہ دلیل دی جا سکتی ہے کہ اگر ان طاقتوں کا اثر و نفوذ مشرقی پاکستان کے عوام پر اتنا ہی زیادہ تھا تو بنگلہ دیش نے علیحدگی کے بعد ہندوستان میں شمولیت کیوں نہ اختیار کر لی ؟ حالانکہ حقیقت تو یہ ہے کہ زبان ' تاریخ اور ثقافت کے اشتراک کے باوجود بنگلہ دیش ہندوستان کے صوبہ مغربی بنگال کے ساتھ ضم ہونے کی بجائے آج بھی اپنے حقوق اور بقاء کی خاطر ہندوستان کے رویے کے خلاف آواز اٹھاتا ہے اور اگر اس بات کو تسلیم کر لیا جائے کہ روس نے بنگلہ دیش بنوایا تو پھر اب دونوں ملکوں کے امریکہ کے زیر اثر ہونے کے بعد یہ کیوں ممکن نہ ہوا کہ یہ دونوں ملک ایک بار پھر متحد ہو جائیں ۔ ان تمام حقائق کے پیش نظر ہمیں اس بات کو تسلیم کرنا چاہئے کہ بنگلہ دیش کو ایک علیحدہ ملک بنانے کے بنیادی محرکات نہ تو بنگالی ہندوؤں کا مبینہ پروپیگنڈہ تھے اور نہ ہی کسی بیرونی طاقت کا نتیجہ بلکہ ہمارے اپنے ہی سیاستدانوں اور راہنماؤں کی کوتاہ نظری اور کوتاہ اندیشی کا منطقی نتیجہ تھے ۔

گو کہ قائد اعظم نے ۱۹۴۸ء میں مشرقی پاکستان تشریف لے جا کر واشگاف الفاظ میں یہ اعلان کیا تھا کہ صرف اور صرف اردو ہی پاکستان کی قومی زبان ہو گی ۔ قائد اعظم کے اس اعلان کے بعد بظاہر تو یہ مسئلہ وقتی طور پر دب گیا تھا لیکن بعد میں اس مسئلے نے زبردست تحریک کی صورت اختیار کر لی اور ایک وقت ایسا آیا کہ مشرقی پاکستان کی کسی بھی سیاسی جماعت کے لئے اردو کی حمایت کرنا ممکن نہ رہا اور ۱۹۵۴ء کے مشرقی پاکستان کے صوبائی انتخابات میں بنگالی زبان کو قومی زبان قرار دینے کا مطالبہ ایک اہم سیاسی نعرہ بن گیا ۔ اس حساس مسئلے کو حل کرنے کی غرض سے بروقت کوئی دانشمندانہ فیصلہ نہ کیا گیا ' جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملک کو توڑنے میں اس مسئلہ نے اہم کردار ادا کیا ۔ حنیف رامے لکھتے ہیں کہ ۔

" حقیقت یہ ہے کہ بین الاقوامی سطح پر سامراجی مقاصد اور ملکی سطح پر سیاسی جبر اور معاشی استحصال کے احساس کے بعد جس ایک بات نے پاکستان کے دو ٹکڑے کروئے وہ زبان تھی (۵) ۔

محمد حنیف رامے کے مندرجہ بالا اقتباس میں چند باتیں بڑی قابل غور و فکر ہیں جن کا خلاصہ کچھ اس طرح سے ہے کہ جب ملک میں معاشی و سیاسی حقوق کے استحصال کا شعور اجاگر ہو جائے تو موقع پرست سیاست دان زبان و ثقافت کے نام پر عوام الناس میں بے چینی پیدا کر کے اپنے مذموم عزائم کی تکمیل کی خاطر انہیں قومی دھارے سے کاٹنے کی کوشش کرتے ہیں جس کے نتیجے میں یا تو ملک ٹوٹ جاتا ہے یا پھر کمزور ہو جاتا ہے ۔

آج کل بھی ملک میں کچھ ایسی ہی فضا پیدا کی جا رہی ہے ۔ ملک میں جگہ جگہ لسانی و قومیتی بنیادوں پر ایسی تنظیمیں قائم ہیں جو اپنے منشور اور بیانات سے یہی تاثر دیتی ہیں کہ ملک میں بسنے والی دیگر قوموں کی طرح ان کی زبان ' تہذیب اور ثقافت الگ ہے اور وہ استحصال کا شکار بھی ہیں ۔ ۔ ہمارا اصل موضوع ایک ایسے ہی خیالات رکھنے والی سیاسی تنظیم " سرائیکی قومی موومنٹ " سے متعلق ہے ۔ ملکی صورتحال کو دیکھتے ہوئے یوں لگتا ہے کہ ہم نے اپنے ماضی سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا ۔ ہم پھر اسی ڈگر پر چلنے کی کوشش کر رہے ہیں جس نے ہمیں تباہی سے ہم کنار کیا ۔ دنیا اپنے مسائل احسن طریقے سے حل کر کے ترقی کی طرف گامزن ہے جبکہ ہم اپنے چھوٹے چھوٹے مسائل کا حل موجود ہونے کے باوجود الجھا کر ترقی کی بجائے تنزل کی عمیق گھاٹیوں میں گرنے کی بلاواسطہ اور بالواسطہ کوششیں کر رہے ہیں ۔ ہمارے لئے غور کرنے کا مقام ہے کہ اگر قبل از قیام پاکستان کی سیاست فرقوں ' صوبوں یا ثقافتی اکائیوں کی بنیاد پر کی جاتی تو کیا پاکستان کا بننا کسی بھی طرح ممکن ہوتا ؟ اور اب بھی یہ سوچنے کی بات ہے کہ کیا آج بھی ان بنیادوں پر کی جانے والی سیاست ملکی استحکام ' ترقی اور قومی یکجہتی کے لئے ممدومعاون ثابت ہو سکتی ہے یا اسے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا ذریعہ ؟ ۔

پنجاب کے جن جنوبی علاقوں میں سرائیکی صوبہ تحریک چل رہی ہے ان علاقوں کا اصل مسئلہ بے روزگاری اور صنعتی ترقی کی شدید کمی ہے ۔ اس میں قصور خواہ کسی کا بھی ہو لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ قیام پاکستان کے بعد جو بھی حکومت برسر اقتدار آئی اس میں ان تینوں ڈویژنوں (ملتان ' بہاولپور اور ڈیرہ غازی خان) کے نمائندے برسراقتدار رہے ہیں ۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۸ء تک مظفر گڑھ کے نواب مشتاق احمد گورمانی پورے پاکستان کی سیاست پر چھائے رہے اور ان کے نمائندے سردار عبدالحمید دستی پنجاب میں ہمہ مقتدر رہے ۔ ڈیرہ غازی خان میں مزاری اور لغاری اقتدار کے ستون مانے گئے ۔

ملتان ڈویژن میں گیلانی اور قریشی خاندان برسراقتدار رہے اور ملتان ڈویژن کے ہی میاں ممتاز محمد خان دولتانہ پنجاب حکومت کے کرتا دھرتا رہے ۔ بہاولپور کے مخدوم زادہ سید حسن محمود ' بھونگ کے رئیس غازی ' بہاولنگر کے لالیکا یا ملک قاسم کا ڈنکا بجتا رہا۔ تاہم یہ بھی ایک سچائی ہے کہ ان لیڈروں کے دور اقتدار میں ان علاقوں کی ترقی خصوصاً صنعتی ترقی پر کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی ۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ان علاقوں میں احساس محرومی پایا جاتا ہے اور ان علاقوں میں احساس محرومی کو ختم کرنے کے لئے علاقے کے سیاستدانوں پر بھاری ذمہ واری عائد ہوتی ہے کہ وہ علاقے کے مسائل کو ترجیحی بنیادوں پر حل کرنے کی بھرپور کوششیں کریں تاکہ نفرت اور تعصب کی آندھی ابتداء ہی میں دب جائے ۔

حوالہ جات

(۱) سرائیکی لوک سانجھ " سرائیکی قومیت " ملتان ' ۱۹۸۴ء ۔ ص ۱

(۲) Speeches of Quaid-i-Azam in the Constituent Assembly of Pakistan (1947-48), Karachi 1950, p. 3.

(۳) ایضاً

(۴) ایضاً

(۵) محمد حنیف رامے ' " پنجاب کا مقدمہ " ' لاہور ' ۱۹۸۵ء ' ص ۹۴

ادارہ کی مطبوعات

آغا حسین ہمدانی : " فاطمہ جناح ۔ حیات و خدمات " ' ۱۹۷۸ء ' ۱۹۲ ص ص ' طبع دوم ' ۱۹۸۹ء = / ۸۰ روپے

احمد سعید : " حیات قائد اعظم ۔ چند نئے پہلو " ۱۹۷۹ء ' ۱۲۴ + ۴ ص ص = / ۳۰ روپے

غلام مصطفیٰ خان : " مولانا عبید اللہ سندھی کی سرگزشت کابل " ' ۱۹۸۱ء ' ۲۸۸ + ۴ ص ص = / ۴۰ روپے

پروین روزینہ : " جمعیت علمائے ہند ۔ دستاویزات مرکزی اجلاس ہائے عام ' ۱۹۴۵ء ۔ ۱۹۱۹ء " ' دو جلدیں '

جلد اول ' ۱۹۸۰ء ' ۵۰۸ ص ص = / ۶۵ روپے

جلد دوم ' ۱۹۸۱ء ' ۴۳۵ ص ص = / ۶۰ روپے

عبیداللہ قدسی : " اسلام کی انقلابی علمی تحریک " ' ۱۹۸۱ء ۱۱۰ + ص ص = / ۲۰ روپے

شفیع النساء ۔ " کتابیاتی اشاریہ پاکستان ۔ ۱۹۷۹ء " ' ۱۹۸۲ء ' ۲۶۰ ص ص = / ۵۰ روپے

منظور الحق صدیقی : " قائد اعظم اور راولپنڈی " ' ۱۹۸۵ء ' ۱۲۲ ص ص = / ۳۰

پیرزادہ محمد حسین : " سفرنامہ ابن بطوطہ " (اردو ترجمہ) طبع ثانی = / ۷۵ روپے

عذرا سلطانہ : " وارث شاہ ۔ عہد اور شاعری " ' ۱۹۸۱ء ' ۲۲۵ ص ص = / ۴۵ روپے